ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

بیگم سلطانہ ذاکر اداؔ کا سفر نامہ "سفر کب تک" ایک عہد کی دستاویز

BEGUM SULTANA ZAKIR ADA'S TRAVELOGUE "SAFAR KAB TAK"A LANDMARK DOCUMENT

Dr. Liaqat,
Government Post Graduate College Mandian Abbottabad.
(Corresponding Author Email: malik.liaqat80@gmail.com)
Dr. Muhammad Kamran Shahzad,
Lecturer Department of Urdu University of Sargodha
Dr. Muhammad Rahman
Assistant Professor Department of Urdu Hazara University Mansehra

Abstract

Begum Sultana Zakir Ada was born in Rampur India. After Independence she migrated to Pakistan. Her husband, was a Captain in Army, Firstly, he was stationed in Karachi then in Rawalpindi and Lahore. In Urdu literature, as a Poetess, she got reputation. It's her quality that she didn't bound herself with Poetry, but in Urdu Prose she distinguished her thoughts, and portrayed her ideas with different sketches.

As for as her Poetry is concerned, three volumes of her poetry had been published. If her poetry is analyzed, there is a depiction of religious touch, she had taken in her family which had a great reputation in the religious domain. She is lucky that she got many opportunities, in Pakistan and abroad to reveal Poetic talent both in Poetry and Prose, especially in woman literature, her name is in on the top of the list.

Key Words:

Begum Sultana Zakir Ada, Rampur India, Pakistan, Captain in Army, Karachi, Poetess, Urdu Prose, Poetic talent, woman literature.

سلطانہ ذاکر اداؔ کی خوش بختی ہے کہ اُنھیں اُردو ادب میں وہ مقام و مرتبہ ملا جو برسوں کی محنت کے باوجود بیش تر اہل قلم کو نصیب نہ ہو سکا۔اُردو ادب میں سلطانہ ذاکر اداؔ کی شخصیت کئی لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے۔ وہ بیک وقت عمدہ شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ اسلوب نثر نگار بھی ہیں۔اب تک اُن کے تین شعری مجموعے اور ایک نثری فن پارہ منظرِ عام پر آچکے ہیں جو کہ اُن کی ستر سالہ زندگی کی سفری داستان ہے۔ "معراجِ وفا "اُن کا پہلا شعری مجموعہ ہے، جو سال ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔جب کہ دوسرا شعری مجموعہ "تکمیل وفا" ہے۔ جو پہلے مجموعہ ہائے سخن کی اشاعت سے ایک ماہ بعد شائع ہوا۔اسی سال ان کا تیسرا شعری مجموعہ "نمودِ سحر" یکے بعد دیگرے منصہِ شہود پر آیا۔ان تینوں مجموعہ ہائے کلام میں جہاں شعبہ زندگی کے مختلف موضوعات کو برتا گیا ہے مگر مجموعی طور پر مذہبی رجحان غالب دکھائی دیتا ہے۔اُن کا چوتھا اور آخری ادبی شاہ کار سال ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔جو صنفِ نثر کے اعتبار سے سفر نامہ ہے ۔ اس میں اُن کی خوب صورت اور رواں نثر اور پر لطف منظر نگاری اور دلچسپ اسلوب قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لیتا ہے۔یہ سیاحت نامہ مصنفہ کے کسی ایک خطے یا شہر کی سفری کہانی نہیں ہے۔بل کہ ۱۹۳۲ ء سے

لے کر ۲۰۰۲ء تک جتنے بھی ملکی یا بیرونی ممالک کے اسفار کیے گئے اُن سب کا حال زمانی اعتبار کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ اگر اس ادبی فن پارے کو ان کی ستر سالہ زندگی کا سفر نامہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ روزنامچوں اور یادداشتوں کے سہارے ان تمام سفری مشاہدات و تاثرات کو اس طرح تسلسل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ گویا ان کی زندگی تمام تر رنگوں کے ساتھ جلوہ گر ہونے لگتی ہے۔ اس میں سیاحت نگار نے جہاں سفری احوال کو بیان کیا ہے تو ساتھ میں اپنے داخلی جذبات و احساسات اور اپنے بیتے لمحات کا ذکر بھی کیا ہے۔ پہلی نظر میں قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ سفر نامہ سے کہیں زیادہ ان کی آپ بیتی ہے اس میں بڑی حد تک صداقت بھی ہے کیوں کہ سفر و حضر کے ساتھ مصنفہ کی زندگی کے یادگار لمحات کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔

یہ سفر نامہ مجموعی طور پر چالیس ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔ جو تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل ضخیم سفر نامہ ہے۔ مصنفہ نے ابتدائی ابواب میں اپنے آبائی قصبے اور رام پور کی سیر و سیاحت کا تذکرہ کیا ہے۔ بعد ازاں امریکہ، سعودی عرب، شام، برطانیہ اور یورپ کے دیگر مختلف مقامات کی سیاحت کا حال بیان کیا ہے۔ ان کا پہلا سفر بذریعہ رتھ ہوا تھا۔ بقول مصنفہ اس وقت ان کی عمر چار سال تھی۔ اگر اسفار کا عہد بہ عہد جائزہ لیا جائے تو اس سے ہمیں نقل و حرکت کے بدلتے ذرائع کا پتہ بھی چلتا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ مصنفہ کا پہلا سفر رتھ سے شروع ہو کر ہوائی جہاز تک تمام ہوا۔ اس کے علاوہ اس سفر نامہ کی یہ انفرادیت ہے کہ اس میں جہاں اندرونِ ملک کی سیاحت کا حال قلم بند ہوا ہے تو دوسری طرف بیرونی ممالک کی سیر و سیاحت کے علاوہ وہاں کے تاریخی، سیاسی، جغرافیائی، مذہبی و تہذیبی اور تمدنی اقدار پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ وہ جہاں بھی گئیں، ہر ایک چیز کا باریک بینی سے جائزہ لینے کے بعد اُس کا موازنہ اپنے ملک و قوم سے کرتی نظر آتی ہیں۔ قیامِ یورپ کے دوران وہ اُن لوگوں کی طرز معاشرت سے بہت زیادہ متاثر ہوئیں۔ خصوصاً اُن کا سماجی شعور دیکھ کر وہ اپنے ملکی باشندوں کو بھی باشعور دیکھنا چاہتی ہیں۔ زندگی میں انسان کی خواہش کبھی بھی مکمل نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ مصنفہ مختلف خطوں سے متعلق اتنی زیادہ معلومات بہم پہنچانے کے باوجود بھی مزید حقائق کو سامنے لانے کی جستجو کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس حوالے سے ان کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے۔

ہوتی نہیں ہے ختم کبھی داستانِ دل
کچھ باب رقم کر دیے کچھ زیرِ غور ہیں (۱)

اس شعر سے اُن کے ذوقِ سیاحت اور حقائق کو بر لانے کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ شعر اکی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ چند لفظوں کو اس طرح پس و پیش کرتے ہیں کہ کسی بھی منظر کا نقشہ چند لفظوں میں کھینچ کے رکھ دیتے ہیں۔ مگر نثر کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ خصوصاً سفر نامہ میں تو جب تک سیاحت نگار کسی خطے سے متعلق حقائق و واقعات کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کرتا تب تک کامیابی نہیں مل سکتی۔ تاہم بیگم سلطانہ ذاکر ادا کے لیے بھی یہ کام جوئے شیر لانے سے کسی طرح بھی کم نہ تھا۔ کیوں کہ وہ بنیادی طور پر شاعرانہ مزاج رکھتی تھیں۔ مگر اُنھوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ایک اچھا نثری فن پارہ ادیب ہی کے قلم سے لکھا جا سکتا ہے۔ اس بات کی زندہ دلیل ان کا سفر نامہ ہے۔ بظاہر یہ سفر نامہ ہے مگر ایسے دلچسپ انداز بیان میں سفری حال کے ساتھ تاریخی اور جغرافیائی حقائق کو بھی بیان کر دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس طویل عرصے کے دوران مختلف خطوں کی تہذیبی و تمدنی اقدار میں جو مد و جزر رونما ہوئے تھے وہ بھی در پردہ منظرِ عام پر آ گئے ہیں۔ نقاش کاظمی سفر نامہ پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سلطانہ صاحبہ کے سفر نامے کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ماحول پر ان کی بڑی گہری نظر ہے شاعروں کے مطالعے کے بعد سلطانہ صاحبہ کی نثر پڑھ کر لطف ملتا ہے اور خاص کر جن لوگوں نے ان سفری مقامات کا مطالعہ کیا ہے اور ان مقامات پر جا چکے انھیں سلطانہ صاحبہ کی تحریر اور زیادہ متاثر کرتی ہے۔ (۲)

سفری مشاہدات کے ساتھ ساتھ ہر خطے کے رسم و رواج کی پہچان کروائی گئی ہے۔ بظاہر یہ اُن کا مقصد تو نہ تھا مگر یہ اُن کا فنی کمال ہے کہ سیر و تفریح کے احوال میں انھوں نے مختلف خطوں کو بھی اپنی دور اندیش نگاہوں سے دیکھ کر حقیقت اپنے قارئین تک باہم پہنچائی۔ جن کی روشنی میں آئندہ اُن ممالک کا سفر کرنے والوں کو خاطر خواہ فائدہ ہوگا۔ جس سے قاری کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس حوالے سے محمد ذاکر علی لکھتے ہیں:

"دنیا کے مختلف ممالک کے باشندگان کے رہن سہن عادات و اطوار، خرید و فروخت کے انداز، بازار، گلیوں کی روداد، شہری و دیہاتی اور کوہستانی مقامات کی جو تصویر کھینچی

ہے وہ بہت دلکش وجاندار ہے۔ان کا یہ سفر نامہ ایک ایسا آئینہ ہے جس کا ہر عکس واضح خدوخال کے ساتھ اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے اور اس میں مقبولیت کے تمام اوصاف پائے جاتے ہیں۔ان کی یہ کاوش سفری ادب میں ایک پر لطف اور معلومات انگیز اضافہ قرار دی جاسکتی ہے۔"(۳)

سفری مشاہدات وتاثرات سے قبل سیاحت نگار نے پس منظر کے طور پر اپنے ستر سالہ عہد کے حالات وواقعات کو بڑے جامع انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ وہی تاریخی حقائق ہیں، جن کی بنیاد پر یہ سفر نامہ دوسرے سفر ناموں کے مقابلے میں منفرد دکھائی دیتا ہے۔ مصنفہ کی ولادت رام پور میں ہوئی تھی۔ جس وجہ سے انھیں اپنے آبائی شہر سے فطری اُنس تھا جہاں کی تاریخی حیثیت عباسی خاندان کے معرکوں سے شروع ہوئی تھی۔رام پور میں ہزار سال قبل مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان خوفناک جنگیں ہوئیں، جن میں مسلمان فاتح ٹھہرے۔ بعدازاں ۱۷۲۱ء میں افغانستان کے روہیلہ قبیلہ کے سردار علی محمد خان روہیلہ نے راجہ ہرنشند کو شکست دے کر بادشاہت کا تاج اپنے سر سجا لیا تھا۔سال ۱۷۷٤ء میں شجاع الدولہ نے سردار محمد علی خان روہیلہ کو شکست دے کر تاریخ اپنے نام کر لی۔

اس میں کوئی حرف نہیں کہ سیاحت نگار مؤرخ تو نہیں ہوتا مگر اپنے سفر نامہ میں وہ تاریخ کے خاص نکتوں کو اختصار سے اشارتاً بیان کر دیتا ہے۔ جس کی روشنی میں حقائق تک پہنچ جاتا ہے۔سلطانہ ذاکر اداآس میدان میں بھی اپنے تاریخی علم سے قارئین کو فائدہ پہنچاتی ہیں۔اس بارے میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی مشمولہ "لمحہ موجود" میں لکھتے ہیں۔

"میں نے روہیل کھنڈ کی زندگی پر بعض خواتین کی تحریریں بھی پڑھی ہیں، لیکن ان تحریروں میں لمحہ موجود کا رنگ چھایا ہوا ملتا ہے۔اداآصاحبہ ماضی قریب کی زبان پر پوری طرح قادر ہیں اور انھوں نے زبان کے جوہر خاص کی پوری طرح حفاظت کی ہے۔"(٤)

مصنفہ نے پس منظر کے طور پر جہاں اپنے شہر کے تاریخی وجغرافیائی حقائق کو بیان کیا ہے تو وہاں اپنے داخلی جذبات واحساسات کی پیوندکاری بھی عمدگی سے کی ہے۔اس حصے میں ان کی بچپن کی یادیں، تعلیم وتربیت، تقسیم ہند اور ہجرت کے تناظر میں درپیش آنے والی مشکلات کے علاوہ رام پور کے تاریخی مقامات بھی شامل ہیں۔ان چند اہم مقامات میں جامع مسجد، قلعہ رام پور، رضا لائبریری، آرٹیلری میدان، باغ پیلس، تاج ہوٹل بمبئی اور رام پور کی آفیسر میس کا حال پڑھنے کو ملتا ہے۔

علاوہ ازیں دوسری جنگ عظیم اور تقسیم ہند پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد قیامت خیز گھڑیاں شروع ہوئیں تو اُس وقت مہاجرین کے جو جذبات واحساسات تھے۔اُن دلخراش لمحات کو مصنفہ نے دلچسپ پیرائے میں اس طرح رقم کیے گویا لفظوں سے تصویر کھینچ دی ہے۔

"لوگ اپنے آباؤاجداد کی قبروں کو چھوڑ کر جانے کے لیے بالکل تیار نہ ہوئے۔انسان اپنی برسوں کی ساکھ اور اپنی گھر ہستیاں چھوڑنے کو دِل دُکھتا ہے۔ہمارے والد اور والدہ پاکستان نہیں آئے۔رام پور ہی میں فوت ہوئے اور وہیں مدفون ہوئے۔ہمارے سسر بھی اپنی عمر کی وجہ سے پاکستان نہیں آئے اور رام پور ہی میں مدفون ہوئے۔"(٥)

ابتدائی چار ابواب اندرونِ شہر ہی سے متعلق ہیں۔ جو رتھ، تانگہ، بائی سائیکل، ہاتھی اور بیل گاڑی کے ذریعے سے پایہ تکمیل کو پہنچے۔اس سے ہمیں بدلتے سفری ذرائع وآمدورفت کا پتہ بھی چلتا ہے۔ پانچویں باب سے لے کر بیسویں باب تک اندرونِ ہندوستان کے مختلف خطوں سے متعلق سفری داستان بیان کی گئی ہے۔ جن میں لکھنو، میرٹھ، دہلی، کوہاٹ، راولپنڈی، کراچی، لاہور شامل ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد رامپور سے ہجرت کر کے کراچی آگئیں۔ہجرت کا سفر اُن کے لیے کسی امتحان سے کم نہ تھا اس دوران انھیں جو مشکلات درپیش آئیں ان کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

"دہلی کے پالم ایئر پورٹ پہنچے، جانچ پڑتال ہوئی، ایک کمرے سے دوسرے کمرے جاتے

رہے۔نہ جانے کتنے کاغذات پر کتنی مہریں اب اندر گئے تو سامان کی دوبارہ تلاشی شروع ہو گئی، سامان بھی تولا گیا اور وہ وزن میں ہمارے الاونس سے کچھ زیادہ نکلا ہم نے اُسے لاکھ سمجھایا کہ ہم ہمیشہ کے لیے پاکستان جا رہے ہیں۔ہمیں اپنی تمام چیزیں لے جانے کا حق ہے۔ مگر وہ نہ مانا۔"(۶)

ایک حقیقی سیاحت نگار کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ حقیقت کا دامن کبھی نہیں چھوڑتا، ادیب کا غیر جانبدار ہونا اُس کے ادبی مرتبہ کا تعین کرتا ہے۔سلطانہ ذاکر ادا نے دوران سفر جہاں جیسا دیکھا اُسے صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیا۔جب وہ رام پور سے ہجرت کر کے نئے نویلے ملک پاکستان کے دارالحکومت کراچی پہنچیں تو وہاں کی بڑھتی ہوئی آبادی، موسمی تغیر کو دیکھ کر بہت زیادہ متاثر ہوئیں اس بارے لکھتی ہیں:

"کراچی کا موسم بالکل بے اعتبار تھا۔نہ گرمی راولپنڈی جیسی تھی اور نہ سردی، بارشیں بھی کم ہوئیں تھیں۔ان بارشوں میں موسم اچھا ہو جاتا تھا اور سارا دن بچے سُرخ رنگ کی بیر بہوٹیاں پکڑ کر ایک شیشی میں جمع کرتے رہتے تھے۔جیسے جیسے آبادی بڑھتی رہی یہ بیر بہوٹیاں کراچی سے غائب ہو گئیں۔"(۷)

ہندو پاک کی طویل سیاحت کے بعد سیاحت نگار کو بیرونی ممالک میں سب سے پہلے جس سرزمین سے پالا پڑا وہ بیت اللہ شریف ہے۔ درحقیقت یہ اُن کے مذہبی عقیدت و محبت کا رشتہ ہی تو ہے، جو اُن کی نثر و شاعری میں یکساں طور پر ملتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں بھی گئیں تو وہاں کے مقدس مقامات پر حاضری یقینی بنائی۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب مکہ مکرمہ کا طواف کرنے کے بعد مدینہ منورہ، دمشق اور شام کے مقدس مقامات کی زیارت کے لیے بھی پہنچیں۔ان مقام مقدسہ میں دمشق کی مسجد بنوامیہ، حضرت زینب کا روضہ مبارک، مسجد بنی نقیہ خصوصی توجہ کا محور رہیں۔ان مذہبی مقامات پر حاضری کے بعد دمشق کے تاریخی مقامات جن میں قصرالبحر، نیشنل میوزیم اور قصرِ الاعظم کی سیر و سیاحت بھی شامل ہے۔ان تاریخی اور مذہبی مقامات کے بعد دمشق کی گلیوں کی خاک چھانتی رہیں۔جہاں پر ان لوگوں کے ساتھ چند ایام بھی گزارے۔اس قلیل قیام کے باوجود وہ کافی اہم معلومات باہم پہنچاتی ہیں۔

"دمشق کا پورا ماحول مغربی یعنی یورپی تھا۔لوگ بھی سفید رنگت کے تھے۔مشہور پہاڑ کوہِ قاف بھی قریب ہی ہے اور وہاں کی گوری رنگت عورتیں الف لیلیٰ جیسی کہانیوں میں پریوں کے نام سے یاد کی گئی ہیں۔یہی کوہِ قاف کا علاقہ وہ جگہ ہے جہاں سے کاکیشن یا سفید فام نسل چلی۔دمشق میں رومی اور یونانی حکومتوں کی تاریخ ہے اور اس کا اندازہ بھی ہر موڑ اور ہر مقام پر ہو جاتا ہے۔"(۸)

سفرِ مدینہ محض روضہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کی غرض سے دوبارہ گئیں جو کہ یقیناً ہر مسلمان کی پہلی اور آخری خواہش ہوتی ہے کہ وہ بار بار گنبدِ خضریٰ کا دیدار کرے۔ بعد ازاں حقیقی سیاحت نگار کے روپ میں یورپ اور امریکہ کی سیاحت کرتی ہیں۔ جو اسفار اُنھوں نے کسی مقصد کے حصول کی خاطر نہیں بل کہ محض سیر و سیاحت کی غرض سے کیے تھے۔یوں وہ حقیقی سیاح کا کردار ادا کرتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہندو پاک اور عرب ممالک کی خاک چھاننے کے بعد یورپ اور امریکہ کی سیاحت کا حال بڑی عرق ریزی سے بیان کیا ہے۔ایک عام سیاحت نگار کی طرح کسی بھی سفر کا سرسری مشاہدہ نہیں کیا بلکہ ایک ادیب کی نظر سے ہر ایک منظر کو اس کی تہوں میں اتر کر دیکھا ہے ۔تاریخ کے وہ مخفی راز جنھیں عام سیاحت نگار کی آنکھ نہیں دیکھ پاتی، مصنفہ اُسے اپنے ذہنی بیداری کی بدولت تمام تر حقائق کے ساتھ منظرِ عام پر لے آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قیام یورپ میں اُنھوں نے اس خطے کا تاریخی حال، سماجی کیفیت، تہذیب و تمدن، رسم و رواج اور مذہبی اقدار تک کا حال پوری وضاحت سے کیا ہے۔قیام یورپ کے ایام میں ان لوگوں کو قریب سے سمجھنے کا موقع ملا، جہاں اُن کی تعلیمی ترقی اور سماجی شعور سے متاثر ہوتی ہیں تو دوسری جانب انھیں اپنا وطن اور اپنی قوم بھی نہ بھولی۔یہ اُن کی

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

وطن دوستی کا زندہ ثبوت ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں بھی گئیں اپنے ہم وطنوں کو نہ بھولیں۔انقلابِ یورپ سے بہت متاثر ہوئیں تو دوسری طرف اپنے خطے کے زوال کا نوحہ بھی کرتی ہیں۔اس کے علاوہ دوران سیاحت جہاں نت نئی تہذیبوں کا ذکر کرتی ہیں تو دوسری طرف مشرق و مغرب کا موازنہ بھی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔یورپی اقوام کی ترقی اور سماجی بیداری کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"یہاں کے صاف ستھرے بازار، زمین دوز ٹرینیں جو وقت پر چلتی ہیں اور بسیں
جن کے ڈرائیور سلیقے سے بس روکتے ہیں، مسافروں کو اُٹھاتے اور اتارتے تھے
دروازے بجلی سے بند ہونے والے تھے۔"(۹)

مصنفہ کو اُس قوم کی جہاں دوسری خصوصیات نے متاثر کیا تو وہاں پر اُن کے سماجی اور مذہبی شعور نے بھی ورطۂ حیرت میں ڈالے رکھا ۔زندہ قوموں کا یہ شعار ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے تاریخی، مذہبی اور تہذیبی ورثہ کا پورا پورا خیال رکھتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اہل مغرب نے اپنے تاریخی و مذہبی آثار کی دیکھ بھال کے لیے باقاعدہ ادارے بنا رکھے ہیں جو انھیں دوام بخشے ہوئے ہیں اور بلا آخر یہی آثار درست حالت میں آئندہ نسلوں کو منتقل کرتے چلے آ رہے ہیں۔ مصنفہ کو اُن لوگوں کی یہ ادا بڑی پسند آئی:

"ہم نے تاریخی باغ اور پرانا پیرا ہاؤس دیکھا۔جرمنی میں بھی دیکھا کہ یہ لوگ اپنی
تاریخ پر بہت زیادہ ناز کرتے ہیں اور نہایت معمولی تاریخی اشیا اور عمارات کو سنبھال
کر رکھتے ہیں۔یہ بھی دیکھا کہ یہاں گرجے جگہ جگہ ہیں۔اور اکثر گرجے بہت قدیم
ہیں۔ان گرجاؤں کی عمارات عموماً تین سو سے پانچ سو سال پرانی ہیں۔جب کہ کچھ
اس سے بھی قدیم ہیں۔تمام عمارات پتھر کی ہیں اور ان کی چھتیں اونچی ہیں اور ان کی
لکڑی کی بلیاں لگی ہوئی ہیں۔"(۱۰)

اجنبی فضاؤں میں سیاحت نگار کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔وہ کسی سے بھی مخفی نہیں ہے، خصوصاً وہ بھی جب ایک صنفِ نازک ہو تو ایسے حالات میں ہر ایک شہر کو اس کی تہوں اتر کر دیکھنا اور حقائق کو منظرِ عام پر لانا جوئے شیر لانے کے برابر ہوتا ہے۔جہاں کی زبان اپنی نہ تہذیب اور نہ ہی کوئی جان پہچان جو ایسے مشکل حالات میں سہارا بنیں گویا ہر ایک چیز اجنبی ہوتی ہے۔ایسے حالات میں تکلیفیں اُٹھا کر قارئین کے لیے معلومات فراہم کرنا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ان کی یہ محنت کسی طرح بھی فراموش نہیں کی جاسکتی۔تاریخ کے مناظر میں مصنفہ لاس اینجلس کے جغرافیائی حقائق سے متعلق لکھتی ہیں:

"لاس اینجلس میں زلزلے بہت آتے ہیں۔پوری گرمیوں میں دل دھڑکتا رہتا ہے کہ
نہ معلوم کب زلزلہ آ جائے۔اس بارے میں حفاظتی اقدامات ٹیلی ویژن پر بھی سکھائے
جاتے ہیں۔"(۱۱)

سلطانہ ذاکر ادا کا یہ فنی کمال ہے کہ اُنھوں نے سفر نامہ میں مختلف اسفار کو اس طرح مرحلہ وار بیان کیے ہیں۔گویا انھوں نے مرقع نگاری کا حق ادا کر دیا ہے ۔زندگی کے تمام اسفار کو ایک ہی سفر نامہ میں اس طرح عمدہ مرتسم کرنا انتہائی مشکل کام ہے مگر ناممکن کو ممکن بنا کر دکھانا ہی تو اصل کمال ہے۔اُن کا اسلوبِ بیان سہلِ ممتنع کی عمدہ مثال اسی وصف کی بدولت قاری کو ایک ہی نشست میں جگ بیتی اور سفری مشاہدات و تاثرات کے ملے جلے رنگ ملتے ہیں۔جن کی وجہ سے دلچسپی دوچند ہو جاتی ہے۔ڈاکٹر محمد علی صدیقی مصنفہ کے فن اسلوب پر یوں رائے دیتے ہیں:

"ادا صاحبہ کا اسلوب نگارش سادہ، سلیس، پُرکشش اور پُرتاثیر ہے۔حقیقت تو یہ ہے کہ
میں ذاکر ادا صاحبہ کی یادداشتوں میں وادی گنگ و جمن کی زبان کا قابل رشک اسلوب پایا۔"(۱۲)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

حاصل کلام یہ کہ سفر نامہ "سفر کب تک" مصنفہ کی ستر سالہ زندگی کا حاصل ہے۔ جس میں اُن کے آبائی قصبے سے سفر شروع ہو کر رام پور، دہلی، لکھنؤ، امروہیہ، کراچی، راولپنڈی، ملتان، لاہور، بھمبر، مکہ مدینہ، دمشق، شام، فرینکفرٹ، جرمنی، سان فرانسسکو، امریکہ، لاس انجلس، لاس ویگاس، سان لوئی، وینکوور اور کینیڈا تک کی سیر و تفریح کا حال تمام تر جزئیات کے ساتھ ملتا ہے۔ مزید یہ کہ اُن خطوں کو سلطانہ ذاکر اداؔ نے زندگی میں ایک بار ہی نہیں بلکہ کئی بار دیکھا ہے۔ جس کا ذکر انھوں نے اپنے سفر نامہ میں بھی کیا ہے۔ گویا اُن کی زندگی ہی سفر کا دوسرا نام ہے۔ وہ ایک عام سیاحت نگار کی طرح محدود نہ رہیں اور خود کو انھوں نے سفری حقائق و واقعات تک مقید نہ رکھا بل کہ تاریخ کے مخفی راز، سیاسی کش مکش، مذہبی جوش و جذبہ اور سماجی حقائق بھی سامنے میں کامیاب ہوئیں۔ سفر کب تک میں وہ تمام فنی صفات پائی جاتی ہیں جو کسی سفر نامے کو ادبی مقام و مرتبہ
تک پہنچا کر دوام بخشتی ہیں۔

حوالہ جات

١ ۔ بیگم سلطانہ ذاکر اداؔ "سفر کب تک" (دیباچہ) سلطانہ ادا پبلی کیشنز، کراچی، ٢٠٠٢ء

٢ ۔ نقاش کاظمی، سفر کب تک، مشمولہ سلطانہ ادا پبلی کیشنز، کراچی، ٢٠٠٢ء

٣ ۔ محمد ذاکر علی " سفر کب تک " دیباچہ، سلطانہ ادا پبلی کیشنز، کراچی، ٢٠٠٢ء

٤ ۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، مشمولہ "لمحہ موجود" قائداعظم اکادمی، کراچی

٥ ۔ بیگم سلطانہ ذاکر اداؔ، "سفر کب تک" سلطانہ ادا پبلی کیشنز، کراچی، ٢٠٠٢ء، ص۔ ٥٢

٦۔ ایضاً، ص۔ ٢٠٣

٧۔ ایضاً، ص۔ ١٤٤

٨۔ ایضاً، ص۔ ٠٢

٩۔ ایضاً، ص۔ ٢٠٣

١٠۔ ایضاً، ص۔ ٢١٣

١١۔ ایضاً، ص۔ ٢٦٣

١٢ ۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، "سفر کب تک" مشمولہ، سلطانہ ادا پبلی کیشنز، کراچی، ٢٠٠٢ء، ص۔ ٧